آزادی کا تصور، ہجرت اور ''چلتا مسافر''

ڈاکٹر عظمت رباب

Dr. Azmat Rubab

Assistant Professor, Department of Urdu,
Lahore College For Women University, Lahore.

ڈاکٹر محمد خاں اشرف

Dr. Muhammad Khan Ashraf

Associate Professor, Department of Urdu,
Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

The independence of Pakistan and the migration of large number of Muslim families from all over India to the provinces comprising Pakistan was a great historical experience. The social upheaval gave birth too many stories of heart rending experiences. Many a novel and short stories have been written on the subject. Ms Altaf Fatima has written four novels which encompassed the tragic tragedy. All of them revolve round the experience of the creation of Pakistan. In this paper, Dr.Azmat Rubab in cooperation with Dr. M.K.Ashraf analysis Altaf Fatima's novel "Chalta Musafir".

اردو افسانوی ادب میں الطاف فاطمہ کا نام نمایاں مقام کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جو موضوعات پیش کیے ہیں ان میں غالب موضوع ہجرت، آزادی کا تصور اور ہجرت کے مسائل و مشکلات کا بیان ہے۔ ان کے چاروں ناول منظرِ عام پر آئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ نشانِ محفل
۲۔ دستک نہ دو
۳۔ چلتا مسافر

۴۔خواب گر

اگر ان ناولوں کی تکنیک پر غور کریں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ یہ ناول عموماً تین اہم مراحل پر مشتمل ہیں۔ پہلے حصے میں آزادی سے قبل کے حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں، دوسرے حصے میں تقسیم اور ہجرت کے مسائل و مشکلات کا بیان ہے اور تیسرے حصے میں پیش منظر کے طور پر آزادی کے بعد کی صورتِ حال کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

الطاف فاطمہ کے ناول عموماً ایک دو یا مرکزی کرداروں پر مشتمل ہوتے ہیں اور باقی کے کردار اسی کردار کے گرد گھومتے یا اثر انداز ہوتے دکھائے دیتے ہیں۔ان کا ناول ''چلتا مسافر'' 1987ء میں فیروز سنز سے شائع ہوا۔''چلتا مسافر'' تقسیمِ برصغیر کے پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے۔اس ناول میں پٹنہ کے ایک خاندان کی کہانی بیان کی گئی ہے جو تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکہ میں ہجرت کر گیا۔کافی عرصہ وہاں رہنے کے بعد جب وہاں مکتی باہنی کی تحریک چلی اور بنگلہ اور اردو کا جھگڑا بڑھا تو اس خاندان پر کیا گزری اس ناول میں تفصیل سے ان کے نفسیاتی، جذباتی، معاشرتی، معاشی اور ذہنی مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ناول کی ابتدا اس لوک گیت کے شعر سے کی گئی ہے:

ننک سی ڈِبیا ڈِب ڈِب کرے
چلتا مسافر گِر گِر پڑے

ناول کے ابتدائی منظر میں ہماری ملاقات نصیبا کے کردار سے ہوتی ہے۔وہ حویلی کی دیگر ملازم خواتین کے ساتھ دھان کو پھٹک رہی تھی۔

''اس کے طباق سے کالے چہرے پر گھومتی ہوئی موٹی بے قرار آنکھوں میں کاجل کی لہر تھی اور سرسوں کے تیل میں چھپے ہوئے کالے بھونرالے بالوں کی کس کر گوندھی ہوئی چٹیا کمر پر لہرا رہی تھی۔ بغیر کور کی میلی دھوتی کے نچلے کناروں سے سیاہ آبنوسی پنڈلیوں کا سانچے میں ڈھلا ہوا گداز جھمک رہا تھا۔''(۱)

تیرہ برس کی عمر میں اس کی شادی ایک گبھرو جوان نصیرو سے ہوئی۔ابھی ان کے بیاہ کو سال نہ گزرا تھا کہ بقرعید کے موقع پر گائے کی قربانی کے حوالے سے ہندوؤں نے حملہ کر کے جن مسلمانوں کو نشانہ بنایا ان میں نصیرو بھی شامل تھا۔چنانچہ وہ واپس سید صاحب کی حویلی آ گئی۔سید صاحب کے دو بیٹے مزمل اور مدثر تھے۔دو بیٹیاں تھیں جن میں ایک کی شادی ڈھاکہ ہوئی تھی جبکہ دوسری کی پنجاب میں۔مدثر شادی شدہ تھا جبکہ مزمل منجھلے بھیا کے نام سے مشہور تھا۔وہ نصیبا کو ہر وقت ڈانٹتے رہتے تھے۔اس کے باوجود وہ ان کی محبت میں گرفتار ہوتی گئی۔

''سید صاحب کا یہ کم بخت لڑکا اتنا غصیلا اور چڑچڑا ہونے کے

باوجود جب بانسری ہاتھ میں لے کر بیٹھتا تو آسمان سے اتر کر آیا ہوا
دیوتا معلوم پڑتا تھا۔'' (۲)

سید صاحب اور مزمل تحریکِ پاکستان کے حامی تھے اور اس کے لیے باقاعدہ سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی بیٹی تبسم کی شادی پنجاب میں کی تو اس کے پس منظر میں جو بات تھی وہ انھوں نے اپنی بیوی سے کہی:

''بیگم! میں تو پاکستان کے استقبال کے لیے اپنا پیادہ بھیج رہا ہوں۔'' (۳)

بیگم کے اس اعتراض پر کہ یہ محض ایک خواب ہے۔ انھوں نے بہت اعتماد سے جواب دیا:

''یہ خواب میں نے اکیلے تو نہیں دیکھا۔ یہ تو میری قوم کا وہ فیصلہ ہے جسے خیبر سے راس کماری تک کے مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔۔۔۔۔ پانچ سال پہلے میری قوم نے جو خواب دیکھا تھا۔ وہ حقیقت میں ڈھل رہا ہے اور ڈھل کر رہے گا۔ تم کہتی ہو میں ایسی باتیں نہ کیا کروں۔ لیکن بیگم، اگر تم بھی لاہور کے اس اجتماع میں موجود ہوتیں تو تم اس خواب کو فراموش نہ کرتیں۔ جناح صاحب کے چہرے کا وہ سکون، وہ عزم اور ہر صوبے کے مسلمانوں کا وہ جوش اور سب سے زیادہ ولولہ انگیز وہ لمحہ جب شیرِ بنگال نے اسٹیج پر آ کر قراردادِ پاکستان پیش کی۔'' (۴)

اس سب کے باوجود مختلف خیالات کے حامل لوگوں کی دوستیاں قائم تھیں اور اس سیاسی اختلاف نے ان کے دلوں میں میل نہیں آنے دیا تھا۔ سید صاحب کے دوست امیر حیدر پکے نیشلسٹ تھے اور ان کا اپنا بیٹا مسلم لیگ کا حامی تھا لیکن دونوں دوست اپنے اپنے نقطہ نظر کو ایک دوسرے پر ٹھونسنے کے بجائے اس کا احترام کرتے تھے۔ پھر جیسے جیسے حالات بدلتے چلے گئے لوگوں کے رویوں میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ یہ صورتِ حال مزمل کے لیے بہت پریشان کُن اور الجھن کا باعث تھی۔

''یہ کیا بات ہے؟ یہ کیا قصہ ہے؟ وہ کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ جس سے بات کرتا تھا، جس کی سنتا تھا، ہر کوئی امن چاہتا تھا، آرام وسکون کا متمنی تھا۔ سب خیریت چاہتے تھے۔ پھر ایک دم یہ خون خرابہ کیسا ہونے لگتا ہے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اس طرح آزادی کیسے ملے گی؟ یوں تو ہم سب آپس ہی میں لڑ لڑ کر مر جائیں گے۔ وہ سیاست، آزادی کی تحریکوں اور ہر قسم کے مطالبوں سے بے زار سا ہو گیا تھا۔ عورتوں اور بچوں کی ڈری ڈری صورتیں، بندوقیں، سونی گلیاں، کٹے

ہوئے اعضا، پھٹے ہوئے سر اور گلی کوچوں کی دیواروں پر چمکتے ہوئے
خون کے چھینٹے۔ یہ سب وہ بڑی خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔''(۵)

اسی دوران ایک دن جذبات سے مغلوب ہو کر نصیبا، نعیم کے سامنے اپنے دل کا راز کھول دیتی ہے کہ وہ مزمل سے دل ہی دل میں محبت کرتی ہے لیکن اس سے اظہار کی ہمت نہیں کر سکتی۔ مزمل یہ باتیں سن لیتا ہے اور اس کے بعد اس کا رویہ بہت جھنجھلایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ یہ انکشاف سن کر دنگ رہ جاتا ہے اور بغیر جتائے یا اظہار کیے نصیبا کو اپنے غصے کا نشانہ بناتا ہے۔

''اور جب وہ شیشۂ دل ریزہ ریزہ ہو کر بکھرے گا جو تمھارے سیاہ
فام اور بدقوے وجود میں اپنے حسابوں بڑی حفاظت سے رکھا ہوا
ہے تو اس کو سمیٹنے کون بیٹھے گا؟ نصیبا بیگم، تم نے کبھی اس بکواس کا
انجام بھی سوچا ہے جو نعیم کے سامنے کر رہی تھیں؟ وہ کھڑا سوچتا رہا۔
کم بخت، یہ سب اگر تو اپنے دل میں رکھے رہتی تو کیا تھا۔ کتنی
حسرتیں، کتنے گِلے شکوے اور کتنے ارمانوں کے جنازے تو نے
اپنے وجود میں چھپا رکھے ہیں، بغیر کسی کو دکھائے اور بغیر کسی کو
بتائے۔ اور ایک اتنی ذرا سی بات کو اپنے اندر سنبھال کر نہ رکھ سکی۔
اب تجھ کو کون بتائے کہ تیرے اندر رہ کر تو یہ ایک ذرا سی بات، ایک
ننھا سا دزدیدہ خیال تھی اور اب اس میں تو نے مجھ کو شریک کر لیا تو یہ
بات ایک بہت بڑا پہاڑ بھی بن سکتی ہے۔ نصیبا، تو تو ایک ایسی آگ
میں کھڑی ہے جو تجھ پر کبھی گلزار نہیں بن سکتی۔ تو پھر تُو نے وہاں سے
مجھے کیوں آواز دی ہے؟''(۶)

نصیبا کے اس اقرار کے بعد ایک دن مزمل نے باتوں باتوں میں اسے جتا دیا کہ وہ اس کے راز کو جانتا ہے اور اسے اپنانے کا خیال بھی ظاہر کر دیا۔ وہ وقتی طور پر تو خوش ہوئی لیکن پھر اپنی حیثیت کو یاد کر کے اس نے مزمل سے کہا کہ وہ اس کے لیے خاندان بھر کی مخالفت مول نہ لے، وہ بوڑھے بشیرے سے شادی کر لے گی۔ اس بات کی خبر بھابی اور ماں کو ہو گئی تو انھوں نے مزمل کی عدم موجودگی میں بہو بیگم کے ہمراہ نصیبا کو بھیج دیا۔ مزمل کو بھابی اور ماں کی حکمتِ عملی سمجھ میں آ گئی کہ انھوں نے نصیبا کو کیوں بھیجا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی عملی قدم اٹھاتا، ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہو گیا۔ اعلان کیا ہوا ہر طرف فساد کی لہر اٹھ کھڑی ہوئی۔ زہرہ اور شہزاد امرتسر سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے لیکن راستے میں ہی فسادات کا شکار ہو گئے۔ مدثر کی شہادت اور باپ کی موت کے بعد مزمل بھابی، دونوں بچوں، ماں اور نصیبا کو ساتھ لے کر ڈھاکہ چلا گیا جہاں ایک ہندو گھنشیام کے متروکہ مکان میں رہنے لگے۔ اس سے

قبل کیمپ میں اس کی ملاقات نصیبا سے ہوئی تھی جس نے اماں سے کہہ کر بڑی بہو کا نکاح مزمل سے کرا دیا تھا۔ مزمل کا بیٹا ہوا۔ نصیبا نے بشیرے سے شادی کر لی تھی اور کبھی کبھار وہ ان لوگوں سے ملنے کے لیے آتی تھی۔ مزمل کے بیٹے ننومیاں سے اس کی بہت دوستی تھی۔

ڈھاکہ میں جو حالات و واقعات مزمل کو پیش آئے وہ نہایت افسوس ناک اور پریشان کُن تھے۔ مشرقی پاکستان میں فسادات کی لہر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اب بنگلہ اردو اور اپنے حقوق کی بات کے لیے لہجے درشت اور دل سخت ہوتے جا رہے تھے۔ مزمل کا بیٹا مدثر یونیورسٹی کے حالات سے پریشان تھا جہاں پڑھائی کے بجائے ہر طرف سیاست کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس سارے تناظر کو مزمل جذباتیت کے بجائے عقلیت سے جانچتا ہے۔ اسی لیے جب مدثر اس سے کہتا ہے کہ یونیورسٹی میں پروفیسر سیاست کرتے ہیں۔ طالب علم سیاست کرتے ہیں۔ تعلیم کا ماحول نہیں۔ یونیورسٹی سیاست، نفرت اور عداوت کا گڑھ بنتی جا رہی ہے۔ نفرت کرنا فیشن بنتا جا رہا ہے۔ تو مزمل اسے کہتا ہے:

> ''لیکن وہ تم سے نفرت کیوں کرتے ہیں، کبھی یہ بھی سوچا تم نے؟ مدثر، نفرت کی وجہ ان کے اندر نہیں، اپنے آپ کے اندر تلاش کرو۔''(۷)

تقسیم سے قبل معاملہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا تھا لیکن یہاں تو مسلمان ہی مسلمان کے دشمن ہوئے جا رہے تھے، اس کی بنیاد میں مذہب نہیں بلکہ زبان اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم تھی۔ مدثر تلخی سے اپنے باپ کے گولڈ میڈل اور تحریکِ پاکستان میں سرگرمی سے شمولیت کے بارے میں سوچ رہا تھا:

> ''دادی اماں کہتی ہیں میرا بیٹا لائق ہے۔ اپنے وقت میں بڑا اچھا ڈبیٹر تھا۔ اس نے کئی مضمونوں میں سونے کے میڈل لیے تھے۔ اس نے یہ کیا، وہ کیا اور ہاں، وہ یہ بھی تو کہتی ہیں کہ تیرے باپ نے تحریکِ پاکستان کے لیے بڑا کام کیا تھا۔۔۔۔ اور اب پاکستان میں آ کر چھوٹی سی جنرل مرچنٹ کی دکان لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ اتنے بڑے ڈھاکہ شہر کے اس غلیظ محلے میں بس یہی دکان ملی ان کو۔ خوب!''(۸)

مدثر کی وساطت سے مزمل کی ملاقات یونیورسٹی کے مقامی طالب علم بذلل سے ہوئی جو مغربی پاکستان سے آئی ہوئی لڑکی سلسبیل پر عاشق ہو جاتا ہے لیکن وہ اپنے تایا زاد سے بچپن ہی میں منسوب ہونے کے خیال سے اپنے دل کی آواز کو دبا دیتی ہے۔ مزمل کو بذلل بہت پسند آیا، وہ اسے اپنے مزاج سے بہت قریب پا رہا تھا۔ اسی لیے اپنے دل کی باتیں وہ اس سے بے تکلفی سے کر سکتا تھا۔

> ''تم اطمینان رکھو، میں پاگل ہونے کی اہلیت کھو چکا ہوں۔ اگر میں

پاگل ہوسکتا تو اس وقت ہوتا جب، جب میں کٹے ہوئے سر الگ اور
دھڑ الگ دیکھا کرتا تھا۔ میں اس وقت پاگل ہوتا جب میں نے
اپنے بھائی کے زخموں سے چور جسم کو مٹی کے سپرد کیا اور دوسرے دن
اپنے باپ کا جنازہ کندھوں پر اٹھا کر چلا۔۔۔۔۔ میں پاگل اس
وقت ہو جاتا جب میں نے تین لُٹی ہوئی عورتوں کی ان کلائیوں کو ننگا
دیکھا جن میں سونے کی چوڑیاں جگمگاتی تھیں۔۔اور۔۔۔اور میں
پاگل اس وقت ہوتا جب کیمپ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں میرا
نکاح میری بڑی بھاوج سے پڑھا دیا گیا تھا۔''(۹)

حالات بدلے تو لوگوں کے تیور بھی بدل گئے لیکن بذل اور اس کے دوست مرلی نے اس کٹھن وقت میں بھی لوگوں کی مدد کرنا نہ چھوڑی۔ مرلی نے سلسبیل کو خاموشی سے ایئر پورٹ پہنچا دیا جہاں سے وہ واپس پنجاب چلی گئی۔ مزمل کے گھرانے کو بحفاظت کیمپ تک پہنچایا۔ وہاں بھی ان کی مدد کی اور یہاں تک کہ مدثر کو کراچی تک پہنچانے کے جو انتظامات خاموشی سے کیے وہ اسی کی ہمت تھی:

''قبرستان جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ قبرستان تو پھیل کر گلی محلوں تک
آ گیا تھا۔ جس طرف جا نکلو، دس پانچ دھڑ، کٹے ہوئے بے شمار
اعضا اور ننھے ننھے بچوں کی لاشیں پڑی نظر آتیں۔ پھر چند لوگ
کھرچالیں اور بیلچے لیے آتے۔ بڑے بڑے گڑھے کھود کر مشترکہ
قبریں بنا دیتے۔ کبھی دو کبھی تین آدمی صف بستہ ہو کر ان بے گور و
کفن لاشوں کے جنازوں کی نمازیں بھی پڑھ لیتے۔ اور پھر گڑھے
بند کر دیتے۔ وہ نہ آتے تو کچھ لوگ پٹرول اور مٹی کے تیل کے ٹین
اٹھائے آتے۔ پٹرول چھڑکتے اور آگ لگا دیتے۔ اور کبھی کبھار ایک
ٹرک آتا۔ سارے بکھرے ہوئے اعضا سمیٹ کر کوڑے کرکٹ کی
طرح بھر کر لے جاتا اور موجوں کے حوالے کر دیتا۔''(۱۰)

مدثر کراچی میں اپنی بقا کی جنگ لڑتا ہے اور وہاں کے لوگوں کے طور طریقے دیکھ کر حیران ہوتا رہتا ہے۔ اس نے اپنے باپ مزمل کو جو خط لکھا اس میں اپنے تجربات، احساسات اور حالات تفصیل سے لکھے:

''ابو، پتا ہی نہیں چلتا کہ اس قوم کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ کسی
کا بازو کٹ گیا ہے۔ یہاں پہنچ کر لگتا ہے کہ ہم جس تجربے اور
واردات سے گزرے تھے، وہ سب ایک وہم اور خیال تھا، اور جو کچھ

بھی جس کے ساتھ ہو گیا، وہ تو ایک پریشان خواب ہے یا چند اخبارات کا اسٹنٹ ہے۔۔۔۔آپ فکر نہ کریں، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ یہاں میلے لگ رہے ہیں۔ باراتیں چڑھ رہی ہیں اور اب تو نوے ہزار قیدیوں کا غم بھی عام نہیں۔تقریروں اور قیدیوں کے کنبوں میں البتہ یہ چرچا سننے میں آتا ہے۔ابھی یہاں بنگالی لوگ ری پارٹیشن کا انتظار کر رہے ہیں۔ہم سے اور آپ سے تو مزے میں ہیں۔ آرام سے اسلام آباد کی کوٹھیوں میں محفوظ ہیں اور ہونا بھی چاہیے۔ ۔۔۔۔میں آپ کی ہر ہدایت پر عمل کرتا رہوں گا۔ان شاءاللہ کبھی کسی پر بوجھ نہیں بنوں گا۔اپنی صلیب آپ اٹھاؤں گا۔''(۱۱)

ڈھاکہ میں مزمل، بذل اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ان کے مشن کا حصہ بن جاتا ہے اور ایک دون راستے میں اسے چھرا گھونپ کر مار دیا گیا اور اسی وقت نصیبا کہیں سے آ گئی۔ بذل کی مدد سے وہ اسے ہسپتال لے گئی لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔

سلسبیل، سلمان سے شادی کے بعد کراچی آئی تو وہاں اسے مدثر نظر آیا جو دوسرے لڑکوں کے ساتھ روزانہ ٹیکسلا کیمپ سے مل میں کام کرنے ریل میں آتا تھا۔ وہ اسے پہچان لیتی ہے اور دل میں سوچتی ہے:

''اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم ایک جوئے خون عبور کر کے اس نئے سفر پر گامزن ہوئے ہو۔آفرین ہے تمھاری خوش دلی اور آنکھوں میں جھمکتے عزمِ حیات پر! میں تمھارے حوصلوں کو سلام کرتی ہوں۔''(۱۲)

وہ اسے بلانا، پکارنا چاہتی تھی اور اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن گاڑی کی وسل سنائی دی تو وہ لڑکوں کی ٹولی کے ساتھ ریل میں سوار ہو گیا۔سلسبیل کو نصیبا کے گائے ہوئے وہ فقرے یاد آ گئے جو وہ بچپن میں مدثر کو سناتی تھی:

نہ لال باغ جاتے
نہ بالم کھیر کھاتے
نہ انگلی کٹنی

سلمان کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ وہ ''چلتا مسافر'' تھا۔

''چلتا مسافر ہے۔سلمان۔بس چلتا رہے گا۔ٹیکسلا سے حویلیاں ۔۔۔حویلیاں سے ٹیکسلا۔''(۱۳)

مزید استفسار پر کہا کہ گھر چل کر تفصیل سے بتاؤں گی۔

یہاں ناول کا اختتام ہو جاتا ہے۔

اس ناول کا بنیادی موضوع بھی تقسیم، ہجرت اور اس کے بعد کے مسائل و مشکلات اور آزادی کے تقاضے ہیں۔ لیکن اس میں فرق یہ ہے کہ یہ ہجرت جو ہندوستان سے مشرقی پاکستان کی گئی تھی اور جس آزادی کے لیے قربانیاں دی گئی تھیں، ان کا ثمر فسادات، قتل و غارت، ہنگامے ہی رہا اور نتیجہ بھی فسادات ہی رہا۔ مشرقی پاکستان آخر کار بنگلہ دیش میں بدل گیا۔ مغربی پاکستان کے رہنے والے ان لوگوں کی قربانیوں کو بھول گئے جنھوں نے آزادی کی خاطر اپنا گھر بار، عزیز و اقارب، مال و دولت، آسائشیں قربان کی تھیں۔ اس کا درد صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اس مرحلے سے گزرے ہوں۔

اس ناول میں مرکزی کردار مزمل ہے اور اسی کے حوالے سے جو دوسرا اہم کردار سامنے آتا ہے وہ بذلل ہے جو ڈھاکہ ہی کا رہائشی ہے لیکن وہ مقامی لوگوں سے مختلف ہے۔ وہ مشرقی پاکستان میں ہونے والے فسادات سے پریشان ہوتا ہے اور پھر فساد کا شکار ہونے والوں کی مدد کرنا اپنا مقصد بنا لیتا ہے۔ مزمل کے گھرانے کی حفاظت اور مدثر کو بحفاظت ڈھاکہ سے نکال کر کراچی تک پہنچانے کا بندوبست کرتا ہے۔ تحریکِ پاکستان کی جدوجہد سے شروع ہونے والے ناول کا اختتام مزمل کی موت پر ہوتا ہے جس کا براہِ راست بیانیہ نہیں ہے بلکہ ایک منظر کے ذریعے قارئین کو علم ہوتا ہے کہ مزمل کو راستے میں چھرا گھونپ کر قتل کر دیا گیا تھا۔

الطاف فاطمہ کے دیگر ناولوں کی طرح اس میں بھی مرکزی موضوع ہجرت اور اس سے متعلقہ مسائل و مشکلات ہیں لیکن ساتھ ساتھ تقسیم سے قبل کی صورتِ حال کو ایک خاندان کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس ناول میں عشق و محبت کے معاملات بھی بیان کیے گئے ہیں لیکن ان کی حیثیت ثانوی اور تحریکِ پاکستان بنیادی موضوع بن کر سامنے آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، ص:۵

۲۔ ایضاً، ص:۱۲

۳۔ ایضاً، ص:۲۵

۴۔ ایضاً، ص:۲۶۔۲۵

۵۔ ایضاً، ص:۵۸۔۵۷

۶۔ ایضاً، ص:۸۵۔۸۴

۷۔ ایضاً، ص:۱۵۵

۸۔ ایضاً، ص:۱۵۸

۹۔ ایضاً، ص:۱۷۰

۱۰۔ ایضاً، ص:۳۱۱

۱۱۔ ایضاً، ص:۱۷۔۳۱۶

۱۲۔ ایضاً، ص:۳۵۷

۱۳۔ ایضاً، ص:۳۵۹

☆.....☆.....☆